نیا گورنر ۶۵ھ کا رمضان ختم ہونے سے پانچ دن قبل کوفہ پہنچا[1]۔ اس کی ابتدائی تقریر سننے شیعے بھی آئے تقریر کے بعد مختار کے بعض سربرآوردہ شیعوں نے ابن المطیع کی تقریر کے ایسے حصوں پر جو ان کے نقطہ نظر سے مختلف تھے خوب نکتہ چینی کی بلکہ نہایت گستاخانہ طریقے پر آوازے کسے۔ ابن مطیع ایک مصلح جو آدمی تھا: اس کی بدقسمتی تھی کہ ایسے ماحول میں جہاں حجاج کا سا تشدد ضروری تھا اس کو حاکم بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے سمجھا بجھا کر شیعوں کو مطمئن کردیا۔ وہ فاتحانہ شان سے لوٹ گئے اور نئے گورنر کی کمزوری سب پر عیاں کرنے لگے گورنر نے ایک لائق عرب کو شہر کا کوتوال مقرر کیا جو خوب چوکنا رہتا اور پولیس کے ساتھ شہر میں گشت لگاتا مختار حکومت کوفہ پر قبضہ کرنے کی جارحانہ تیاریاں کرنے لگا۔ یہ طے پایا کہ ۶۶ھ کے محرم میں یعنی نئے گورنر کی آمد کے چھ مہینے بعد بغاوت کی جائے موالی اور پامالِ جفا غلاموں کا وہ مربی اعظم بن گیا۔ اپنی چرب زبانی، حسن سلوک اور اہل بیت کی محبت کے دعووں سے اس نے ان کے دل موہ لئے۔ موالی میں بہت سے لوگ ساسانی کیوتری اور حاکم طبقہ کے تھے جو اساورہ اور مزارج کہلاتے تھے یہ لوگ ۱۲ھ سے ۲۱ھ تک کی فتوحات میں گرتے ہوئے ایرانی اقبال کی زد میں آکر مسلمان ہوگئے تھے اور ان قبیلوں سے خود کو ضم کر لیا تھا جو آنحضرت سے قریب تھے جن قبیلوں سے یہ منسلک ہوئے وہ جنگ کے موقع پر ان سے مدد لیتے تھے لیکن مال غنیمت سے اس بنا پر ان کو محروم رکھتے کہ یہ ان کے آزاد کردہ (موالی) تھے۔ حکومت کے محاصل میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ تھا اس وجہ سے باہم قبائلی یا سیاسی جنگوں سے یہ گریز کرتے اور اگر مجبوراً لڑتے بھی تو دل سے اپنی شایان شان شجاعت کے ساتھ نہ لڑتے اور موقع پاکر بھاگ جاتے مختار پہلا شخص تھا جس نے اس امتیاز کو مٹایا، ان کو اپنا معتمد بنایا، مال غنیمت اور محاصلِ حکومت میں ان کو عربوں کے ساتھ مساویانہ حقوق دینے کا وعدہ کیا اور دوسری طرف اہل بیت کے حامی کی حیثیت سے ان کی روحانی وفاداری بھی حاصل کی۔ مصنف اخبار الطوال ص۲۹۷ لکھتا ہے: "مختار بن عبید (بعد رہائی)، شیعوں سے ملتا پھرتا اور وہ اس کے پاس آتے جاتے رہتے، وہ ان کو اپنے

---

[1] طبری ۶/۹۰



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ساتھ بغاوت کرنے اور حسینؓ کا انتقام لینے کے لئے اکساتا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی دعوت مان لی ان میں اکثریت قبیلۂ ہمدان (جس سے حجر بن عدی کا تعلق تھا) اور ابنائے عجم (فارسی نسل) کی تھی جو کوفہ میں آباد تھی جن کو معاویہ نے باقاعدہ افواج میں داخل کر لیا تھا ان کو حمراء (سرخ رنگ) کہا جاتا تھا۔ ان کے تقریباً بیس ہزار جوانمرد کوفہ میں آباد تھے۔؎

مختار کے لئے ایک تیسرا خطرناک لمحہ پھر آیا۔ اس کی سرگرمیاں باوجود محتاط ہونے کے نہ چھپ سکیں۔ کوتوال نے کئی بار اس کی مسلح تیاریوں کی گورنر سے شکایت کی۔ گورنر یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ جب تک بغاوت کھل نہ جائے میں محض شک پر کوئی تعزیری کارروائی نہیں کروں گا حکومت کے وفادار قبائلی مکھیوں نے حالات کی ابتری کا اس کو احساس دلاتے ہوئے مختار کو قید کرنے کا مشورہ دیا گورنر نے مختار کے چچا زاد بھائی زائدہ بن قدامہ کی معرفت اس کو بلایا (قید کرنے کے ارادہ سے زائدہ کو گورنر کا ارادہ معلوم تھا وہ گیا اور مختار کو پیغام دیا۔ مختار اٹھ کر تیاری کرنے لگا کہ اتنے میں زائدہ نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس سے مختار خطرہ تاڑ گیا اور کپڑے اتار کر بیماروں کی شکل بنا کر چارپائی پر لیٹ گیا، رضائی منگوائی اور کہنے لگا: "معلوم ہوتا ہے مجھے بخار آئے گا سارے جسم میں کپکپی ہو گئی ہے۔" زائدہ نے واپس جا کر گورنر کو مختار کی علالت کی خبر دی۔ گورنر نے یقین کیا اور مختار کی طرف سے غافل ہو گیا۔

مختار جب بغاوت کے انتظامات مکمل کر رہا تھا تو شیعوں کے چند مذہبی مکھیوں کو اس بات پر شک ہوا کہ وہ ابن الحنفیہ کی طرف سے مامور ہے وہ مذہبی قسم کے لوگوں کا ایک وفد لے کر ابن الحنفیہ کے پاس تحقیق حال کے لئے مکہ روانہ ہوئے۔ ابن الحنفیہ سے مل کر انھوں نے کہا: "مختار آپ کے مامور ہونے کے مدعی ہیں اور ان چار امور کی طرف دعوت دے رہے ہیں ۱۔ کتاب اللہ و سنت نبی ۲۔ اہل بیت کے قتل کا بدلہ ۴۔ کمزوروں کی حمایت ہم نے ان کی بیعت تو کر لی لیکن مناسب سمجھا کہ آپ سے مل کر ان کی صداقت کی تحقیق کر لیں اگر آپ کا حکم ہو تو ان کی اطاعت کریں ورنہ ان کو چھوڑ دیں۔" ابن الحنفیہ نے جواب میں کہا: "خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ جس کی مدد سے چاہے خدا دشمنوں سے ہمارا انتقام لے؎" ان مبہم الفاظ سے وفد نے نتیجہ نکالا کہ مختار کو ابن الحنفیہ کی تائید حاصل ہے۔

؎ طبری ۷/۹۶



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



# مولانا ابوالکلام آزاد کا سفرِ عراق

## افسانہ ہے یا حقیقت؟

(جناب مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی)

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں اختلاف ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں کیونکہ علامہ ذہبی کے بقول علماء کے لئے سب سے بڑا فتنہ معاصرت ہے اس کے اسباب پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں، لیکن اس اختلاف کا اظہار کسی خاص نجی مجلس میں اشارہ کنائے میں بالفرض محال تصریح کے ساتھ بھی ہوا ہو تو ممکن ہے کہ ہوا ہو۔ مگر قلم کی زبان اور عوام کی نظر ایسی اختلاف نما تحریر سے ناآشنا تھی۔ مولانا آزاد کی طرف سے تو حسب معمول سکوت تھا اور ہے۔ لیکن سید صاحب ضبط پر قادر نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ موصوف کے دل میں کچھ ہے۔ جیسے کہہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر خدا جانے کیوں کہتے کہتے رک جاتے ہیں۔ اور پر معنی انداز سے مسکرا کر نکل جاتے ہیں۔

اول اول اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا۔ جب مولانا آزاد ۱۹۴۵ء میں قلعۂ احمد نگر کی ڈھائی سالہ قید اور نظر بندی سے آزاد ہوئے اور کچھ عرصہ بعد ان کے مکاتیب کا ایک مجموعہ "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (اب مرحوم) کے نام جیل کی تنہائی میں عالم خیال میں لکھے گئے۔ وہی "عالم خیال" جس کو مخاطب کر کے شوق قدوائی مرحوم نے کہا ہے ؎

اے مرے خیال تو کل کہاں کہاں گیا   میں بھی ترے ساتھ تھا تو جہاں جہاں گیا

اور رہائی کے بعد مطبوعہ صورت میں مولانا شروانی مرحوم کی خدمت میں ارسال کئے گئے اس کتاب پر



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ریویو کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے تعلق خاطر کو "معارف" اعظم گڑھ جون ۱۹۴۶ء کے شذرات کے تیسرے پیرے میں یوں ظاہر کیا ہے کہ

"مخاطب تنہا "صدیق مکرم" حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں۔ جن کے ساتھ ان کے چہل سالہ تعلقاتِ محبت ہیں۔ لیکن بعض ان کے ایسے "صدیق" عزیز بھی زندہ ہیں۔ جن کو گو دوستی کا دعویٰ نہیں مگر نیازمندی کا تو بہرحال ہے اور جس کی مدت اس چالیس سال کے تعلق سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لسان الغیب حافظ نے اس واقعہ کی پیشین گوئی صدیوں پہلے اپنے اس شعر میں فرمادی تھی

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را "

اور انہی سطور کے معارف شذرات کا جو خلاصہ یہ ہے کہ:

مولانا نے اپنے خطوں کے مجموعہ کا نام غبار خاطر رکھا ہے اس میں گل و بلبل اور بادہ و تریاک کی حکایتوں کے پردے میں دراصل انہوں نے اپنے سوانح کے بعض گمشدہ اوراق بطور غبار لکھے ہیں اور بعض ایسے حالات سپرد قلم کئے ہیں جو اپنی نصف صدی کی قلمی زندگی کے عرصہ میں پہلی دفعہ انہوں نے ظاہر فرمائے ہیں مثلاً زبان انگریزی سیکھنے کے سفر کے جستہ مشاہدات ضرورت تھی کہ موصوف ان مقدمات کا استاد اور رفیق سفر بھی ظاہر فرماتے تاکہ ان کے سوانح نگار ان کی سوانح عمری کے جو لکھے ہیں ان کو مناسب جگہ پر رکھ سکتے۔ (معارف اعظم گڑھ عت جلد ۵ [illegible])

ان سطور کا سوال اور مدت سفر کا دریافت کرنا دو سبب سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بقول سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے سوانح نگار کی آئندہ مشکل دور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ خود علامہ ندوی کو شک تھا کہ آیا یہ سفر عراق واقعہ ہے یا افسانہ۔ ہم نے جس وقت یہ ریویو پڑھا تو سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہی خیال آیا تھا کہ غالباً حضرت سید صاحب مولانا آزاد کے بیان کو کسی شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر اپنے شبہ کو تو بصورت الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے پردے میں مستور کر کے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات رفت گذشت ہوئی۔

آخر وہ وقت بھی آیا جو ہم سب کو پیش آتا ہے، یعنی صاحب غبار خاطر کے "صدیق مکرم" مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا اگست ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے جاننے پہچاننے والوں کو بقدر تعلق خاطر صدمہ ہوا

© rasailojaraid.com

خود مولانا ابوالکلام آزاد کے دل پر کیا گذری اسی کا جاننا مشکل ہے، لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے جذبات حزن و ملال کا اظہار معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں کر دیا جو مولانا شروانی مرحوم ہی کے تذکرۂ جمیل پر مشتمل ہے۔ حضرت سید صاحب اپنے مقالہ "آہ! مولانا شروانی" کی ابتدا ان لفظوں سے کرتے ہیں کہ :-

"اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا۔ خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا۔ اور اپنی دوری، مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا۔ میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین میں رکھ لئے تھے اب جب مرحوم کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی (معارف نمبر ۶ جلد ۶۶ صفحہ ۴۰۳)

حضرت سید صاحب کے اسی مضمون میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ اس عنوان سے آیا ہے کہ جس سے جون ۱۹۵۲ء کے معارف کی پردہ دارانہ نکتہ چینی بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ علامہ سید سلیمان کا ارشاد ہے کہ مولانا شروانی مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے۔ عمر کے ساتھ کچھ تو کچھ خانگی افکار نے بھی ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا۔ ان کے قویٰ میں سب سے پہلے ان کے حافظہ نے جواب دیا۔ اکثر باتیں بھول جاتے تھے۔ جب کاروان خیال لکھا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں ان کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ "ہاں مجھے یاد ہے کہ دونوں جوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے۔ تفصیلات اب معلوم ہوئیں۔ میں نے انہیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر شاید (۱۹۰۷ء میں) دو نوجوان سفر عراق کو نکلے تھے جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے مگر دوسرے ابوالکلام نہیں۔ بلکہ حافظ عبدالرحمن امرتسری تھے۔ اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے۔ بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا ہندوستان خبر آئی۔ تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن و غم کا اظہار فرمایا۔ اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کے اس طرح تصدیق کرنے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی۔ اور کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے اس کے جواب سے اعراض کرتے۔ اسی سے ان کے ادا شناس ان کے مطلب کو سمجھ جاتے"۔ (معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۵۵ تا ۴۵۶)

اوپر کی عبارت سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ مولانا شروانی سیاست سے الگ رہتے تھے۔

۲۔ ان کو ملک اور خانگی حالات نے غمگین کر دیا تھا۔ مگر وہ خاموش رہتے تھے۔

۳۔ عمر اور افکار کی زیادتی کی وجہ سے ان کے حافظہ نے جواب دے دیا تھا۔ اس لئے واقعات بھول جاتے تھے۔

۴۔ مولانا ابو الکلام نے اپنے مندرجہ کاروانِ خیال خط میں اپنے سفرِ عراق کا جو ذکر کیا ہے وہ افسانہ ہے واقعہ نہیں۔

۵۔ لیکن مولانا شروانی نے کاروانِ خیال میں اس افسانہ کی تصدیق کر کے اسے تاریخ بنا دیا۔

۶۔ چونکہ مولانا شروانی بحث نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے حضرت سید صاحب کے توجہ دلانے پر بھی انھوں نے سکوت فرمایا۔

۷۔ مولانا سید سلیمان نے جو کہ ان کے ادا شناس تھے سمجھ لیا کہ مولانا شروانی گو اپنی غلطی مان گئے ہیں مگر حسب عادت خاموش ہیں اور بات درست وہی ہے جو قبلہ سید صاحب فرماتے ہیں

۸۔ بقول سید صاحب شروانی صاحب کہتے ہیں کہ سفرِ عراق پر جو دو نوجوان نکلے تھے ان میں سے ایک کا نام غلام محی الدین تھا اور دوسرے کا نام ابو الکلام

۹۔ حضرت سید صاحب کے نزدیک مولانا آزاد کے بڑے بھائی کا نام غلام محی الدین تھا اور وہ عراق میں فوت ہو گئے تھے۔

۱۰۔ غلام محی الدین کا دوسرا ہم سفر مولانا ابو الکلام نہ تھے بلکہ حافظ عبد الرحمٰن امرتسری تھے وغیرہ

اب آسیئے! تنقیحات مندرجہ بالا کی روشنی میں "کاروانِ خیال" کی ورق گردانی کر کے اصل بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میں علامہ سید سلیمان کی عبارت منقولہ کی حقیقت تلاش کریں۔ مگر پیشتر اس کے کہ "کاروانِ خیال" کو دیکھا جائے یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "کاروانِ خیال" مولانا شروانی اور مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۰ء اور اس کے بعد آپس میں ایک دوسرے کو لکھے گئے۔ اور انھیں مولوی عبدالشاہد خاں شروانی مقیم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے "غبارِ خاطر" کی اشاعت کے بعد ۱۹۴۶ء میں مرتب کیا اور مدینہ پریس بجنور میں چھپوا کر اسی سال شائع کیا اس وقت اسی کاروانِ خیال کی دہی پہلی اشاعت میرے سامنے ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۰ء میں جو "کاروانِ خیال" طبع اول کے صفحہ ۶۰ سے شروع ہو کر ۶۵ پر تمام ہوا ہے اپنے دلربا اور مخصوص انداز میں اپنے ۳۲ برس پہلے کے سفرِ عراق کا ذکر فرمایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی مکتوب کا متعلقہ حصہ یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ مولانا آزاد کی خلوص پسند اور جویای خلوص طبیعت کا رنگ اور سفرِ عراق کی داستان سمجھنے میں آسانی ہو۔ مولانا آزاد ابتدائی گفتگو کے بعد مولانا شروانی سے خطاب کرتے ہیں کہ:-

آپ نے ایک بات خوب لکھی ہے۔ خلوص سدا بہار ہے۔ اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ کیا کہوں اس جملہ نے دل پر کیا اثر کیا اس کلمۂ حق کی شرح میرے دلِ درد مند سے پوچھئے۔ اکاون[۵۱] برس کی عمر ہو چکی۔ چند ماہ بعد باون[۵۲] برس پورے ہو جائیں گے گویا انگریزی محاورے میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے "رانگ سائڈ" میں پوری طرح آچکا۔ عام طور پر لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مبدءِ فیاض کی بخششِ خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلے سے گذار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش و آگہی کے گذر چکے۔ اس چالیس[۱] برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں۔ صورت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا۔ جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلوتہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو۔ لیکن اگر آپ

[۱] خط کشیدہ الفاظ مولانا شروانی کے ہیں جو ان کے مکتوب مشمولہ "کاروانِ خیال" طبع اول کے صفحہ ۶۲ پر موجود ہیں۔ شہاب



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا کام آیا؟ تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں۔ زندگی کا حاصل اور عیشِ دنیا کا سرمایہ ہے سے

ہر آنکہ خاطر مجموع و یارِ ہم نشیں دارد — سعادت ہم دم او گشت و دولت ہم قریں دارد

کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسر آجاتے ہیں تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سن لیتا ہوں کہ کامل معنی میں سرد و ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں کل رات کو نو بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی۔ کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ریڈیو کو چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگِ تازہ میں گا رہا تھا:

ز دلبرم کہ رساند نوازشِ قلمی — کجاست پیکِ صبا گر ہمی کند کرمی

حدیث چون و چرا دردِ سر دہد ساقی — پیالہ گیر و بیاسا ز عمر خویش دمی

بیا! کہ وقت شناسان دو کون بفروشند — بیک پیالۂ صافی و صحبتِ صنمی

وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھئے بعینہ یہ غزل آج سے ستیس برس پہلے ایک بزم اُنس میں سنی تھی اور کہاں سُنی تھی؟ بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر۔

عُیُونُ المَہَا بَیْنَ الرُّصَافَةِ وَالجِسْرِ!

مرزا محمد کاظم رشتی نے کہ اعیان شہر میں سے تھے اور زیورِ فضل و دانش سے مجلّیٰ اپنی کشتی میں یہ مجلس ترتیب دی تھی۔ ایک تازہ وارد مغنی نے کہ مشہدی کے نام سے مشہور تھا عود پر اپنا کمال دکھایا تھا۔ کیا عرض کروں دل پر کیا گذری۔ حافظ کی یہ غزل حسب حال اشعار اور ستیس برس پہلے کی بچھڑی ہوئی دنیا کا تصور ایک عجیب عالم طاری ہو گیا۔ عراق کی گذری صحبتیں ایک ایک



© rasailojaraid.com